**ڈاکٹر ریحانہ کوثر**
اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اُردو
لاہور کالج برائے خواتین یونیورسٹی لاہور

# نذر سجاد حیدر کی سوانحی تحریریں

Nazar Sajjad was an outstanding writer of her time. Her writings were publisher almost in every literary magazine of repute. She is said to be the first short story writer of Urdu. Even if this claim is not acceptable because of some doubts, it cannot be rejected that she was the first women short story writer. More than six collections of short stories can be prepared from her writings. She was a popular novelist of her times. She wrote her autobiography in the form of a Diary (Roznamaha) and Memoir (Sargazishat) that was published in various issues of Tehzeeb-i-Niswan of Lahore and Ismat of Karachi. But it is deplorable that in our times no one knows even her name. And in the books of history of Urdu biography, novel and short story not a single line is found about her literary achievements with the exception of few words about her novels only. Her Memoirs and Diary are a treasure of cultural information of her times. Apart from their historical value these writings have a fine flavour and charming prose style. The writer of present article has tried to bring into light the salient features of Nazar Sajjad's Diary and Memoirs.

اردو زبان کے مورخین اور نقادوں کی بے علمی، تساہل پسندی اور غفلت شعاری کا بقول قرۃ العین حیدر یہ عالم ہے[۱] کہ وہ سجاد حیدر یلدرم کو بالعموم محض ''ترکی افسانوں کے مترجم'' کہہ کر سرسری طور پر بات ٹال دیتے ہیں جب کہ وہ ایک ایسے ادبی پیش رو اور تخلیقی ادیب تھے کہ پریم چند کے افسانہ نگاری شروع کرنے سے چار برس پہلے یعنی ۱۹۰۳ء تک وہ اس میدان میں اپنا مقام اور مرتبہ اس حد تک محفوظ کرا چکے تھے کہ نقادوں نے اُن کے افسانوی اکتساب کا جائزہ لینا شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ رسالہ مخزن مارچ ۱۹۰۳ء میں ''اردو زبان اور افسانہ نگاری'' کے عنوان سے غلام بھیک نیرنگ کا ایک تفصیلی جائزہ شائع ہوا جو ''زہرہ''[۲] کے تنقیدی جائزے پر مشتمل ہے۔[۳]

یہ سلوک ہمارے ادبی مورخوں اور نقادوں کا ایک ایسے ادیب کے ساتھ ہے جس کے فن کا مطالعہ تقریباً ہر یونیورسٹی کے ایم اے اردو کے نصاب میں شامل ہے ایسے میں اس ادیب کی اہلیہ نذر سجاد کو اگر ادب کے استاد اور طالب علم ان کی بے پناہ صلاحیتوں اور سینکڑوں جاذب توجہ تحریروں کے باوجود نہ پہچانیں تو اس میں کیا تعجب ہے کہ ان کی تو کوئی بھی تحریر کسی درجے کے اردو نصاب کا

حصہ نہیں۔

شمیم احمد نے اپنے ایک مضمون میں اردو کے نقادوں کی اسی ادبی بے بضاعتی ، کوفہمی اور سہل انگاری کو اردوادب کے زوال کا سب سے بڑا سبب قرار دیا ہے۔[۴] اور ڈاکٹر محمد احسان الحق نے اپنے ایک لیکچر میں ہماری زبان کے بڑے بڑے لکھنے والوں کے گم نام ہو جانے کی ایک بڑی وجہ یہ بتائی تھی کہ ہمارے ادبی تنقید نگار اور مؤرخ صرف ان ہی تحریروں کو پڑھتے ہیں جو کتابی صورت میں شائع ہو جاتی ہیں اور آسانی سے بازار یا کتب خانوں سے مل سکتی ہے۔ رسالوں میں شائع ہونے والی تخلیقات پر ان کی نظر کم ہی پڑتی ہے اور پڑتی بھی ہے تو ایسی تحریروں پر جن کو سمجھنے کے لئے دماغ پر زیادہ زور نہیں دینا پڑتا یا وہ تحریریں پڑھی جاتی ہے جن پر دوستانہ تنقید لکھ کر صاحب تحریر کو ممنون کرنا مقصود ہوتا ہے۔۔۔ وہ تحریریں جو آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے کتابی شکل میں یا رسالوں میں شائع ہوئیں اور جن کا حصول مشکل ہے، ان کے بارے میں ہمارے نقاد کی معلومات صفر کے برابر ہیں گویا یہ ہمارے ادب کا حصہ ہی نہیں ہیں۔

نذر سجاد حیدر جن کا صحیح نام نذر زہرا بیگم تھا[۵] میر نذر الباقر اور مصطفائی بیگم کے ہاں ۱۸۹۲ء میں سیال کوٹ میں پیدا ہوئیں۔ با صلاحیت ایسی تھیں کہ ۱۹۰۵ء میں (بعمر ۱۳ سال) ان کی تحریریں شائع ہونی شروع ہو گئی تھیں۔ ۱۹۰۹ء میں جب سید ممتاز علی نے لاہور سے بچوں کا رسالہ ''پھول'' جاری کیا تو نذر زہرا بیگم کو جو بنت نذر الباقر کے نام سے لکھتی تھیں، اس کا ایڈیٹر مقرر کیا۔ ''پھول'' نوشہرہ میں ایڈٹ ہوتا تھا اور دارالاشاعت پنجاب لاہور سے شائع ہوتا تھا۔ (نذر زہرا کے والد میر نذر الباقر اُن دنوں نوشہرہ میں تعینات تھے)[۶]

اسی زمانے میں نذر زہرا نے بچوں کے لئے باتصویر کہانیوں کی کتابیں شائع کروائیں مثلاً ''سلیم کی کہانی''، ''دکھ بھری کہانی''، ''پھولوں کا ہار'' اور'' سچی رضیہ اور اس کی بکری'' وغیرہ۔ بنت نذر الباقر (نذر زہرا بیگم) کی یہ کتابیں محکمہ تعلیم پنجاب نے بچوں کے زاید از نصاب مطالعہ کے لئے خریدیں تھیں[۷] آج اردو ادب کے عام قاری کا تو خیر ذکر ہی کیا ،کہ اساتذہ و مؤرخین و نقادوں کو بھی نذر زہرا بیگم اور ان کی نگارشات کے بارے میں شاید کم کم ہی معلوم ہے جبکہ ۱۹۱۰ء کے زمانے میں جب ان کا مقبول ترین ناول ''اختر النساء بیگم'' شائع ہوا تھا تو ان کا شمار اس وقت کے اردو کے اکابر (مثلاً علامہ راشد الخیری ، ڈاکٹر سر محمد اقبال، شیخ عبدالقادر اور سجاد حیدر یلدرم) میں ہوتا تھا[۸]

نئی نسل کے نقادوں اور ادب کے طالب علموں کو شاید یہ تو یاد ہوگا کہ کبھی اردو کا پہلا افسانہ نگار کون؟ کی بحث میں پریم چند ، یلدرم اور راشد الخیری کے نام بڑے زور و شور اور دلائل و براہین کی گھن گرج کے ساتھ لئے جاتے تھے لیکن یہ شاید معلوم نہ ہو کہ یہ دعویٰ کرنے والے بھی کبھی ہوا کرتے تھے کہ خواتین میں اردو کا پہلا افسانہ جس عورت نے لکھا تھا وہ نذر زہرا بیگم تھیں اور یہ دعویٰ کرنے والے کوئی اور نہیں راشد الخیری کے وارث مولانا رازق الخیری تھے جنہوں نے رسالہ ''ساقی'' کراچی کے جوبلی نمبر میں لکھا تھا:

> '' منشی پریم چند سے بھی پہلے محترمہ نذر سجاد حیدر ،مختصر افسانے لکھ رہی تھیں ۔عورتوں میں افسانوی ادب کی ابتدا انہوں نے ہی کی ان کے افسانے اکثر و بیشتر حقوق نسواں کی حفاظت اور آزادیٔ نسواں کی حمایت میں لکھے گئے ان کے درجنوں افسانوں میں سے جو مختلف رسائل میں شائع ہوئے۔ نصف درجن کے قریب مجموعے شائع ہو سکتے تھے لیکن

آج تک ایک مجموعہ بھی کتابی شکل میں نہیں چھپا، حالانکہ ان کے ناول بار بار چھپتے اور ہاتھوں ہاتھ نکلتے ہیں۔'' [9]

میری زیرِنظر تحریر کا موضوع ''نذر سجاد حیدر کی سوانحی تحریریں'' ہے مجھے افسوس ہے کہ اپنے موضوع پر گفتگو سے قبل مجھے نذر سجاد حیدر کی ادبی حیثیت کے بارے میں مندرجہ بالا طویل تمہیدی معروضات پیش کرنے کی ضرورت پڑ گئی۔ یہ ضرورت ہرگز پیش نہ آتی اگر اردو کی ادبی تنقید اور تاریخ نویسی محض حصول منفعت و شہرت کا وسیلہ نہ بن گئی ہوتی اور اس کے تخلیقی ادب کا افق نقادوں اور مؤرخوں کی تساہل پسندی کے سبب ایسے دھندلکوں میں نہ کھو جاتا جن میں آج سے ساٹھ ستر سال پہلے مختلف و متنوع موضوعات پر معیاری تحریروں کے انبار لگا دینے والی شیخ عبدالقادر اور نذر سجاد حیدر جیسی عظیم ہستیوں کے خوب صورت چہرے ایسے چھپ گئے ہیں کہ اول الذکر کی پہچان صرف اس سے ہے کہ انہوں نے بانگ درا کا دیباچہ لکھا اور وہ ''مخزن'' کے ایڈیٹر تھے اور آخر الذکر کی شناخت کا تو کوئی حوالہ بھی آج کسی کو نہیں معلوم۔

نذر سجاد حیدر نے بیسیوں ناول اور افسانے لکھنے کے علاوہ، تحریک تعلیم و آزادئ نسواں کے موضوع پر اتنا زیادہ لکھا ہے کہ اس کے سرسری ذکر کے لئے بھی متعدد صفحات کی ضرورت ہے لہٰذا میں اس سے قطع نظر کرتے ہوئے ان کی صرف سوانحی تحریروں کے بارے میں کچھ عرض کروں گی۔ سوانحی تحریر اور سوانح عمری باہم مشابہہ ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ سوانح عمری میں ایک انسان کی زندگی کے حالات و کوائف شروع سے آخر تک بیان کئے جاتے ہیں گویا یہ ایک انسان کی مکمل تاریخ کا شعوری اور فنی بیان ہوتی ہے۔ سوانح عمری کا موضوع انسان ہوتا ہے اور انسان کے احوال و کوائف (خارجی و داخلی) کے بیان کے لئے مختلف ذرائع سے مواد حاصل کیا جاتا ہے اور پھر اس مواد کی مناسب جانچ پرکھ کے بعد موزوں اسلوب میں بیان کر کے سوانح عمری کی تشکیل کی جاتی ہے۔ سوانح عمری کے فن کے بارے میں زیرِنظر تحریر میں تفصیلات میں جانے کی گنجائش نہیں اس موضوع پر اردو میں اگرچہ زیادہ نہیں لکھا گیا لیکن جتنا بھی لکھا گیا ہے اس سے اس ادبی صنف کے اصول و لوازم اور حدود و قیود بخوبی واضح ہو جاتے ہیں۔ [10]

مثلاً ڈاکٹر فاخرہ ممتاز نے انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے حوالے سے لکھا ہے کہ ---''سوانح عمری کسی فرد کی پیدائش سے لے کر موت تک کے خارجی حالات کے ساتھ ساتھ داخلی کوائف (جذبات و احساسات) کے بیان پر مشتمل ہوتی ہے--- جہاں یہ تاریخ کی طرح کسی فرد کے حالات زندگی بتاتی ہے وہاں فکشن کی طرح اس کی (باطنی) زندگی کی نقاب کشائی بھی کرتی ہے۔ جس طرح اول درجہ کا مؤرخ حقیقت سے چشم پوشی نہیں کر سکتا اُسی طرح اچھے سوانح نگار کے لئے بھی حقیقت سے دامن کشی ممکن نہیں۔ فرق یہ ہے کہ سوانح نگار حقائق کا ذکر مؤرخ کی طرح نہیں بلکہ تخلیقی فن کار کی طرح دل کش پیرایہ بیان میں کرتا ہے تاہم کسی شاعر، ادیب، مصور یا نقاش کی طرح اس کے تخیل کو پرواز کی (کھلی) آزادی حاصل نہیں ہوتی بلکہ اُسے مواد کو اس طرح پیش نظر رکھنا پڑتا ہے کہ شخصیت کے خط و خال اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ واضح ہو جائیں لیکن اس کے ساتھ سچائی اور دیانت داری کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے'' [11]

آپ بیتی یا خودنوشت سوانح عمری---عام سوانح عمری سے ان معنوں میں مختلف ہوتی ہے کہ اس میں ''موضوع'' خود لکھنے والے کی ذات ہوتی ہے۔ یہ بھی ایک انسان کی تاریخ ہوتی ہے لیکن ایک انسان کی ایسی تاریخ جسے اس نے خود لکھا ہو۔ ایک مکمل

خودنوشت (آپ بیتی) وہ ہوگی جس میں پیدائش سے وفات سے پہلے تک کے حالات و واقعات و کوائف کا بیان ہو۔ ایسا بیان جو خس و خاشاک سے پاک ہو اور جس میں بے جا نمائش ذات یا اخفائے حال سے پرہیز کیا گیا ہو۔ سوانح عمری اور آپ بیتی کی ان تعریفوں کے پیش نظر نذر سجاد حیدر کی کسی تحریر کو مکمل سوانح عمری یا آپ بیتی نہیں کہا جا سکتا۔ تاہم ان کی دو طویل تحریریں جو ''روزنامچہ'' اور ''ایام گزشتہ'' کے عنوانات سے مختلف اوقات میں قسط وار شائع ہوئیں انہیں بھرپور اور جان دار سوانحی تحریروں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ یہ تحریریں ایسی سادہ لیکن دل نشیں زبان میں لکھی گئی ہیں اور بیان میں ایسا توازن اور اعتدال ہے کہ معمولی تراش خراش سے انہیں جیتی جاگتی بھرپور آپ بیتی میں ڈھالا جا سکتا ہے۔

نذر سجاد حیدر کے اپنے بیان کے مطابق انہوں نے ---روزنامچہ (ڈائری) اپنی والدہ کے انتقال کے وقت نوعمری کے زمانے میں، ۱۹۰۸ء سے ''تہذیب نسواں'' میں لکھنی شروع کی تھی۔ ایک عرصے تک باقاعدہ لکھتی رہیں یہ سلسلہ سجاد حیدر یلدرم کے ملازمت سے سبک دوش ہو کر لکھنؤ میں جا بسنے تک چلتا رہا۔ (پھر رک گیا) ۴۱ یا ۴۲ء میں سید امتیاز علی تاج کی فرمائش پر دوبارہ روزنامچہ ''تہذیب'' میں چھپوانا شروع کیا۔ اپریل ۴۳ء میں یلدرم کی وفات پر یہ سلسلہ بند ہو گیا اور کئی سال بعد رازق الخیری کے کہنے پر، جس قدر ''تہذیب'' میں لکھا گیا تھا اس سے آگے رسالہ ''عصمت'' کراچی میں شروع کر دیا گیا۔[۱۲]

راقم ''تہذیب نسواں'' اور ''عصمت'' کے وہ تمام شمارے باوجود کوشش کے حاصل نہیں کر سکی جن میں نذر سجاد حیدر کی خود نوشت کے سلسلے میں یہ تحریریں شائع ہوئیں اس لئے میرے لئے یہ کہنا مشکل ہے کہ ''عصمت''، کراچی میں اس کی اشاعت کا آغاز کب ہوا۔ تاہم جو پرچے میرے سامنے ہیں ان کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ اپریل ۵۲ء سے عصمت میں نذر سجاد حیدر کی آپ بیتی کے ذیل کی یہ تحریر جو پہلے ''تہذیب نسواں'' اور عصمت میں ''روزنامچہ'' کے عنوان کے تحت شائع ہوتی رہی تھی، ''ایام گزشتہ'' کے عنوان سے شائع ہونے لگی۔ عنوان بدلنے کی وجہ نذر سجاد نے یہ بیان کی ہے کہ ---رازق الخیری (مدیر) کا عنوان پر یہ اعتراض ہے اور بالکل بجا ہے کہ ڈائری (روزنامچے) کا اسلوب اس تحریر میں بالکل نہیں ہے۔ لہٰذا اب میری زندگی کا یہ سچا افسانہ ''ایام گزشتہ'' کے عنوان سے شائع ہوا کرے گا۔[۱۳]

نذر سجاد حیدر کی جو سوانحی تحریریں میرے پیش نظر ہیں (روزنامچہ اور ایام گزشتہ) یہی مصنفہ کے احوال و کوائف اور دید و شنید کے بیان اور اسلوب تحریر کے اعتبار سے ایک اچھی بھلی آپ بیتی (خودنوشت سوانح عمری) کی ہم سر ہیں اگرچہ یہ تحریریں ایک عرصے تک ''روزنامچہ'' کے عنوان سے شائع ہوتی ہیں لیکن روزنامچہ یا ڈائری کا سا عدم توازن ان میں برائے نام ہے ''ورجینا وولف'' نے ڈائری (روزنامچہ) کو آپ بیتی میں اس لئے شمار نہیں کیا کہ اس کے بقول:

> A diarist easily falls in the habit of recording certain types of feelings and neglecting others.... therefore leaving a record that is unbalanced. "[۱۴]

جب کہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ نذر سجاد حیدر کی مذکورہ تحریروں میں یہ خامی نظر نہیں آتی وہ اپنے مخصوص حالات یا احساسات بیان کرنے میں کبھی اتنی محو نہیں ہو جاتیں کہ دوسروں کو فراموش یا نظر انداز کر دیں۔ وہ اپنا حال بھی لکھتی ہیں، اپنے جذبات و احساسات بھی بیان کرتی ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ اپنے گرد و پیش کے اشخاص و افراد کے بارے میں بھی واضح باتیں بتاتی چلی جاتی ہیں۔

(ملاحظہ ہوں روزنامچہ کی وہ اقساط جو۱۹۴۲ء کے تہذیب نسواں کے شماروں میں شائع ہوئیں)

روزنامچوں کا بیان بالعموم سرسری، سطحی اور مختصر ہوتا ہے، کیوں کہ روزنامچے (ڈائری) کے اندراجات ایک طرح کے نوٹس (Notes) یا ---- یادداشت کے سلسلے کی تحریر ہوتے ہیں۔ جس سے ان کا لکھنے والا کسی آئندہ زمانے میں کوئی مفصل، پہلو دار اور گہری چیز تیار کر سکتا ہے اس کے برعکس آپ بیتی میں گہرائی، اور تفصیل ہوتی ہے سرسری پن کے بجائے انہماک اور توجہ کے عناصر صاف نظر آتے ہیں۔ میں اپنی اس بات کی وضاحت کے لئے موازنے اور تقابل کی غرض سے حجاب امتیاز علی اور نذر سجاد حیدر کے روزنامچوں سے ایک ایک اقتباس پیش کرتی ہوں۔ پہلے حجاب کے روزنامچے کا ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو:

> ۲۵ جولائی ۱۹۴۲ء۔ ہر وقت کہانیاں سوچنا اور لکھنا--- اور پھر سوچنا یہ ایسی گردش ہے کہ بعض اوقات زندگی ایک دل چسپ کہانی معلوم ہوتی ہے۔ مگر زندگی کی کہانی میں واقعات کا ضابطہ نہیں ہوتا۔ البتہ اس کا پلاٹ حد درجہ پے چیدہ ہوتا ہے--- آج ڈاکٹر ''ح'' کا قاصد آیا انہوں نے چند جدید وضع کے زنانہ نام منگوائے تھے-- Suro کا ایک ڈراما Croice پڑھا خاصا تھا۔ مگر میرے نزدیک ڈراما، کہانی یا فلم وہی ہے جو دیکھنے یا پڑھ چکنے کے بعد گھنٹوں یا ہفتوں یا دنوں ہمارا تعاقب کرے--- شام کو سلیم ممتاز کی عیادت کو گئی بے چارے کو دوسری مرتبہ ری لے پس (Relapse) ہوا ہے اور ٹمپریچر ۹۹ اور ۹۸،۸ کے درمیان رہتا ہے باقی علامات تسلی بخش ہیں۔ گیارہ بجے واپس آکر کھانا کھایا پھر کچھ دیر باغ کے چبوترے پر چاندنی میں ٹہلتی رہی۔'' [۱۵]

حجاب کی اس تحریر کا سرسری پن اور اس میں بے کار باتوں کا اندراج (کھانا کھانے کا اور چبوترے پر ٹہلنے کا ذکر) نیز اس کا مبہم انداز اور بیان کی تشنگی ایسی چیزیں ہیں جو پہلی ہی نظر میں سامنے آجاتی ہیں اب اس کے مقابلے میں نذر سجاد حیدر کی روزنامچے کے سلسلے کی تحریر ملاحظہ ہو۔ یہ درست ہے کہ مصنفہ اسے روزنامچہ کہتی ہے لیکن اس کے انداز و اطوار اس کے ایک معیاری اور دل چسپ آپ بیتی ہونے کا صاف اور واضح اعلان کر رہے ہیں۔

> '' یکم جنوری ۱۹۰۹ء ۔آہ آج ہم سے وہ مقام بھی چھوٹ رہا تھا جہاں دنیا میں ہمیں سب سے زیادہ چاہنے والی محوخواب تھی ۔آخری ملاقات کو وہاں جانا ہوا۔
>
> ؎ بستی خموشاں تھی کہ سنسان پڑی تھی
>
> لڑکی کوئی، اک قبر پہ حیران کھڑی تھی
>
> ۲۶ مئی ۱۹۱۲ء۔ آج کا دن میری زندگی کا اہم ترین روز تھا صبح نماز کے لئے جو آنکھ کھلی تو گھر میں کچھ اور ہی سامان دیکھا۔ میری رشتہ دار بزرگ بیبیاں کسی نئے آنے والے مہمان عزیز کی آمد اور خاطر داریوں کے انتظام میں مصروف تھیں۔ گھر کا چھوٹا بڑا نوکر چاکر سب بے انتہا خوش نظر آرہے تھے مگر صاحب خانہ بہت ملول و اداس تھے یہ خوشی کے سامان دیکھ کر کسی کی یاد میں میرا دل بھی ڈوبا جا رہا تھا۔ آہ! آج سب سے زیادہ خوش ہونے والی اور انتظامات کرنے والی اس دنیا میں موجود نہیں میں ایک تنہا گوشے میں بیٹھی اس کی یاد میں آنسو بہا رہی تھی۔

نو بجے کے قریب یہ خبر پہنچی کہ سٹیشن سے مہمان آگئے--- دن مہمان داری اور خوشی کی تقریب میں گزر گیا شام کے چھ بجے

وہ وقت آ گیا جب کہ میں ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے کے سپرد کر دی گئی۔ یہ وقت بھی عجیب تھا ماں کی یاد پہلے ہی تڑپا رہی تھی اب باپ اور بہن بھائی سے بھی جدا ہونا نظر آ رہا تھا۔ جس شخص کے ساتھ وابستہ کر دی گئی تھی اس سے شناسائی تک نہ تھی۔ اس شام دل کی عجیب کیفیت تھی۔'' [۱۶]

آپ بیتی اُس وقت کامیاب اور مکمل ہوتی ہے جب آپ بیتی نویس اپنے ذاتی حالات و کوائف کو بلا کم و کاست بیان کرے۔ اپنے احوال کے بیان میں مبالغہ (بڑھا چڑھا کر پیش کرنا) یا اخفا سے آپ بیتی کی قدر کم ہو جاتی ہے بلکہ ایسی تحریر آپ بیتی کہلائی جانے کی مستحق نہیں رہتی۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر سید عبداللہ کا خیال ہے کہ آپ بیتی لکھی ہی نہیں جا سکتی۔ کیوں کہ اُن کے خیال میں کسی شخص میں اتنی جرأت نہیں ہوتی کہ وہ اپنی کمزوریوں اور خامیوں کو بلا جھجک بیان کر سکے [۱۷] افسوس کہ سید صاحب مرحوم کو نذر سجاد کی آپ بیتی کے سلسلے کی تحریریں (روزنامچہ اور آیامِ گزشتہ) دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ ورنہ وہ یہ دیکھتے کہ اس خاتون نے ایک عورت ہوتے ہوئے بغیر کسی ادعا کے کس طرح صاف گوئی سے اپنے ایسے احوال بھی آج سے ساٹھ سال پہلے بیان کر دیے جو کوئی مرد آج بھی نہیں کر سکتا۔

ماہ رمضان میں روزہ کھول کر تقریباً سحری کے وقت تک موسیقی سے لطف اندوز ہونے کا ذکر گراموفون کا ریکارڈ لگا کر نہیں بلکہ خود ستار اور ہارمونیم پر گا بجا کر، یہ ایسی بات ہے کہ اس کو اگر کوئی مرد روا بھی سمجھتا ہے تو آج بھی شاید اس کے کھلم کھلا اظہار و اعلان کی ہمت نہ کرے لیکن نذر سجاد حیدر نے اپنے اس شوق اور شغل کا بیان ایسی سہولت اور سادگی سے کیا ہے کہ جیسے کوئی بالکل معمولی سی بات ہو۔ ماہ رمضان میں اور وہ بھی ستائیسویں کی رات کو موسیقی کی محفل سجنے کا بیان خود نذر سجاد ہی کی زبان سے سنیئے۔ اقتباس ذرا طویل ہے لیکن مصنفہ کی سادگی و بے باکی اور جرأت کا اندازہ دلانے کے لئے اسے پیش کئے بغیر چارہ نہیں۔

> '' بیگم رضا اللہ صاحبہ کے ہاں رمضان بہت ہی پر لطف گزر رہا تھا افطاری تو میں کھاتی نہیں تھی بس روزہ کھول کر دو انڈے اور دو پیالیاں چائے بہن پلا دیتی تھیں۔ اس کے بعد تھوڑا سا ہلکا کھانا کھاتی۔ (ہاں سحری کی ہمیشہ سے پنجاب سے عادی تھی۔ مقوّی اور وزنی غذا کھانے کی اس لئے کہ دن میں روزہ تکلیف نہ دے کیونکہ زود ہضم غذاؤں سے دن میں بھوک بہت ستاتی ہے۔ تو سحری کو وہ خود تو دودھ میں جلیبیاں ڈالتیں کبھی ڈبل روٹی کبھی کھچڑی کھاتیں۔ کبھی پلاؤ۔ ایسی ہلکی چیزیں کھاتی تھیں اور میرے لئے روزانہ پراٹھا اور دو انڈے فرائی اور دو پیالیاں چائے کا انتظام ہوتا تھا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ گوشت بھی ضرور کھاؤں۔ کباب، قیمہ یا چاپس ضرور ہوتے تھے لیکن اتنی گنجائش نہ رہتی تھی تو میں وہیں تخت پر قالین پر لیٹ جاتی تھی اور بہن ہنستی تھیں کہ آپ کھاتے کھاتے لیٹ کیوں گئیں۔ میں جواب دیتی کہ اگلا کھانا ذرا نیچے کو ہو جائے تو کباب اور چاپس کے لئے جگہ نکل سکے۔ بے گوشت کے میں روزہ نہ رکھ سکوں گی۔ غرض اسی طرح نہایت خوشگوار دن کٹتے چلے جا رہے تھے۔) ہر قسم کی موسیقی سے مجھے بھی لگاؤ تھا اور بہن مسز رضا اللہ کو بھی رمضان میں تو قرآن شریف، نماز تراویح کا زور تھا اور ہم دونوں کا جی چاہنے لگا کہ تھوڑا سا ہارمونیم اور ستار بھی سنا جائے تو روزہ کا پورا مزہ آئے گا ہم دونوں تنہا تھے کیا اچھا لگتا دو ایک اور شریک چاہئے تھیں۔ اب کس کو رمضان میں گانے بجانے کی دعوت دی جائے۔ ایک غیر شادی شدہ سہیلی وہاں موجود تھیں دل

چاہتا تھا کہ اور کوئی ہو نہ ہو وہ ضرور موجود ہوں۔ خدا معاف کرے ہم دونوں نے یہ تجویز کی کہ آج ستائیسویں شب ہے یہ ساری رات جاگ کر عبادت میں گزارنی چاہیے۔ میں نے بہن سے کہا کہ اول شب نماز وغیرہ سے فراغت پا کر پچھلی رات میں ہم اپنا رنگ جمائیں خدا معاف کرے گا۔ چنانچہ میں نے اپنی سہیلی انجمن آرا بیگم کو رقعہ لکھا۔ پیاری بہن آپ کو معلوم ہے کہ آج ستائیسویں شب ہے آج تمام رات عبادت میں گزاریں گے آپ اپنے والد سے پوچھ کر آجائیں۔ تو بہت اچھا ہو۔ یہ پرچہ انھوں نے اپنے والدین کو دکھایا اور ستائیسویں شب کو عبادت کے لئے انہیں ہمارے ہاں آنے کی اجازت مل گئی اور چند ہی منٹ بعد اُن کی ڈولی آ پہنچی۔ انجمن آرا کی شکل دیکھتے ہی ہم کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔ اور وہ پریشان کہ آخر یہ دونوں مجھ کو دیکھ کر بے تحاشا کیوں ہنسنے لگیں۔ وہ کبھی شود سے ہمارے چہروں پر نظر ڈالتیں کبھی اپنے لباس کی طرف دیکھتیں کہ میرے کپڑوں میں تو کوئی ناموزونیت نہیں کہ جس پر ان کی یہ طنزیہ ہنسی ہے ۔۔۔ ہم اپنی دھوکہ بازی پر ہنس رہی تھیں۔ اور وہ بے چاری حیران تھی میں نے اُن کا ہاتھ پکڑ کر بٹھایا اور پروگرام کی ان کو اطلاع دی پھر تو اُن کو بھی ہنسی آئی اور حواس بجا ہوئے۔ وہ روزہ افطار کر آئی تھیں اب ہم تینوں نے مل کر کھانا کھایا۔ آج بہن نے دہلی کی شب دیگ پکوائی تھی اور نیاز بھی دلوائی تھی۔ بریانی اور شاہی ٹکڑے بھی تھے۔ غرض کھانے بہت ہی مزیدار تھے اور میں حیران تھی کہ سب کھا کر سحری کو پراٹھا کیسے نگلا جائے گا۔ کھانے کے کمرے سے نکل کر نماز عشاء اور تراویح میں مشغول ہو گئے۔ پھر آج کی شب کی کچھ نفلیں دعائیں اور درود وغیرہ شروع کئے۔ ایک بجے عبادت کا یہ سلسلہ ختم ہوا تو میں نے چپکے سے اُٹھ کر وہیں جانماز پر انجمن آرا کے پاس ایک چھوٹا سا ہارمونیم رکھ دیا۔ وہ ہنستے ہنستے لوٹ گئیں اور کہنے لگیں خدا خوب جانتا ہے۔ آپ نے مجھے بُلایا تو اسی لئے تھا۔ خدا کے بہلانے کو تھوڑی دیر کے لئے جانماز پر چڑھا دیا۔

اب ہم تینوں وہاں سے ڈرائنگ روم آ گئے اور وہاں فرش پر بیٹھ کر ساڑھے چار بجے تک خوب ہارمونیم پیٹا گیا اور ستار بجایا گیا۔ کھانے کے کمرے سے سحری کے انتظام میں برتنوں کے کھٹکنے اور نوکروں کی آوازیں آنے لگیں۔ گھڑی دیکھتے ہیں تو ساڑھے چار بج چکے تھے۔ یہ شیطانی دھندا ختم کیا اور سحری کے لئے اُٹھے اس کے بعد صبح کی نماز کا وقت آ گیا غرضیکہ اس رات ایک منٹ کیلئے نہ لیٹی نہ سوئے۔ [۱۸]

نذر سجاد حیدر کی آپ بیتی کے سلسلے کی یہ تحریریں بیان کی سادگی، بے ساختگی اور سچائی کے نقطۂ نظر سے ایسی وقیع ہیں کہ ان کے مکمل مطالعے ہی سے ان کی صحیح قدر قیمت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ایک تعارفی تحریر سے ان کے حسن و جمال کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ حیرت ہے کہ ان تحریروں کو ایسا کچھ زیادہ قدیم نہ ہونے کے باوجود آپ بیتی اور سوانح نگاری کے بارے میں لکھنے والوں نے یکسر نظر انداز کئے رکھا۔ جب کہ یہ تحریریں ہمارے ادب کی دو اہم شخصیات (مسز یلدرم اور سجاد حیدر یلدرم) کے بارے میں بیش بہا معلومات کا خزینہ ہونے کے ساتھ ساتھ اس دور کی سماجی اور تہذیبی زندگی کے بارے میں بھی کسی دستاویز سے کم نہیں ہیں۔

# حوالہ جات وحواشی

۱۔ قرۃ العین حیدر۔ کارِ جہاں دراز ہے، سنگ میل پبلی کیشنز: لاہور، ۲۰۱۰ء، ص:۱۲

۲۔ ''زہرا'' ناولٹ، از، ناظم نبی زادہ کا ترجمہ، مطبوعہ کالج بک ڈپو علی گڑھ ۱۹۰۲ء۔۔۔ بحوالہ، پروفیسر ثریا حسین، انتخاب یلدرم۔ اترپردیش اردو اکیڈمی: لکھنؤ، ۱۹۸۵ء، ص:۱۱

۳۔ قرۃ العین حیدر، کتاب مذکور، ص:۱۲۵

۴۔ شمیم احمد۔ ''ابوالفضل صدیقی کو سمجھنے کے لئے'' مضمون۔ مشمولہ، سہ ماہی ادبیات جلد۲۔ شمارہ ۵۔۶ جولائی تا دسمبر ۱۹۸۸ء۔ ص: ۱۷۶ تا ۱۷۸۔

۵۔ قرۃ العین حیدر، کتاب مذکور ص:۱۴۵

۶۔ ایضاً، ص: ۱۵۹

۷۔ ایضاً، ص: ۱۵۹

۸۔ ایضاً ص: ۱۵۹

۹۔ ثریا حسین، پروفیسر، کتاب مذکور ص: ۲۳، ۲۴ (حاشیہ)

۱۰۔ سوانح نگاری کے فنی تقاضوں کے بارے میں ڈاکٹر سید شاہ علی نے اپنی کتاب ''اردو میں سوانح نگاری'' گلڈ پبلشنگ ہاؤس کراچی ۱۹۶۱ء کے پہلے دو ابواب میں اور ڈاکٹر فاخرہ ممتاز نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے ''اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقا'' (رونق پبلشنگ ہاؤس دہلی ۱۹۸۴ء) کے باب اول میں بڑی سلجھی ہوئی گفتگو کی ہے۔ ''اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقا'' (اردو اکیڈمی سندھ، کراچی ۱۹۶۱ء) الطاف فاطمہ کا ایم اے (اردو) کا مقالہ ہے۔ یہ شاید فن سوانح نگاری اور اردو میں سوانح نگاری کی روایت پر اردو میں پہلی مبسوط تحریر ہے اور اس لحاظ سے قابل قدر ہے۔ الطاف فاطمہ نے تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاک و ہند (اردو ادب جلد پنجم) مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی، لاہور ۱۹۷۲ء میں بھی ''اردو سوانح نگاری'' کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا۔ لیکن اپنے ایم اے کے مذکورہ مقالے کے دس گیارہ سال بعد کی اس موضوع پر ان کی یہ تحریر متاثر نہیں کرتی محض خانہ پُری کے لئے ہے۔ سوانح عمری کی ایک قسم آپ بیتی یعنی خودنوشت سوانح عمری پر ''نقوش'' آپ بیتی نمبر (جون ۱۹۶۴ء) میں مولانا غلام رسول مہر، مولانا علم الدین سالک، ڈاکٹر سید عبداللہ، یوسف جمال انصاری اور ریحانہ خانم کے مضامین معلومات افزا اور پرمغز ہیں۔

''نقوش'' ہی کے شمارہ نمبر ۱۳۴، دسمبر ۱۹۸۶ء میں ڈاکٹر گیان چند کا ایک مقالہ بہ عنوان ''اردو کی ادبی نثر کی اصناف'' شائع ہوا۔ موضوع چونکہ خاصا پھیلا ہوا ہے اس لئے ڈاکٹر صاحب بیس بائیس صفحے میں اسے خاطر خواہ طور پر سمیٹ نہیں سکے۔ سوانح کے ضمن میں انہوں نے اپنے اس مقالے میں جو کچھ لکھا ہے وہ تشنہ بھی ہے اور الجھن پیدا کرنے والا بھی مثلاً وہ فرماتے ہیں:

سوانح: اس میں کسی شخص کے حالات زندگی اور شخصیت کے بارے میں لکھا جاتا ہے یہ ایک مختصر مضمون بھی ہوسکتا ہے۔ پوری کتاب بھی۔ پہلے اسے سیرت کہا جاتا تھا جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں شخصیت کا بیان اہم ہوتا تھا۔ سیرت کی جمع سیر ہے فارسی کی سیر العارفین صوفیوں کا تذکرہ ہے، سیر المتاخیرین، تاریخ کی کتاب ہے اور اردو کی سیر المصنفین مصنفہ محمد یحییٰ تنہا تاریخ ادب ہے عام قارئین ان ناموں میں سیر کو غلطی سے سُیر بہ یائے ساکن پڑھ لیتے ہیں۔ اردو میں سیرت النبیؐ مشہور سوانح ہے۔'' (ص۸۹)

ڈاکٹر گیان چند کی مندرجہ بالا تحریر میں مندرجہ ذیل باتیں غور طلب ہیں۔ ۱۔ ایک مختصر مضمون اور پوری کتاب، دونوں سوانح ہو سکتے ہیں۔ ۲۔ انہوں نے تین کتابوں کے نام گنوائے ہیں جن کے عنوان میں لفظ ''سیر'' آتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ان میں سے ایک تذکرہ ہے دوسری تاریخ اور تیسری تاریخ ادب۔۔۔ میں حیران ہوں کہ جب یہ تینوں کتابیں مختلف موضوعات سے تعلق رکھتی ہیں تو ان کا سوانح

کے ذیل میں ذکر کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔ بہر حال میری اس گفتگو کا مقصد یہ ہے کہ ادب کے قاری کو مطالعے کے وقت چوکس رہنا چاہیئے زیرِ مطالعہ تحریر ڈاکٹر گیان چند جیسے سکہ بند فاضل ہی کی کیوں نہ ہو۔سوانح عمری کے فن کے بارے میں متذکرہ مفصل تحریروں کے علاوہ ان کتابوں میں بھی خاصا وقیع موادمل جاتا ہے۔ جو۔۔۔اردو کے سوانح نگاروں مثلاً حالی،شبلی وغیرہ کے بارے میں یا کسی کے احوال و آثار کے بارے میں لکھی گئی ہیں مثلاً ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی کا شان دار تحقیقی مقالہ۔''مولوی نذیر احمد دہلوی۔ احوال و آثار'' اور ڈاکٹر سید عبداللہ کی کتاب''سرسید احمد خاں اور ان کے نام و رفقا کی نثر''

۱۱۔ فاخرہ ممتاز، ڈاکٹر۔ اردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقا، رونق پبلشنگ ہاؤس:،دہلی،۱۹۸۴ء،ص:۲۴

۱۲۔ سجاد حیدر یلدرم کی وفات کے سبب''روزنامچہ'' کی اشاعت دفعتاً نہیں رکی تھی۔''تہذیب نسواں'' کے دفتر میں اس تحریر کے سلسلے کا اتنا مواد موجود تھا کہ اس ہفتہ وار پرچے کے ۸مئی ۱۹۴۳ء کے شمارے تک میں شائع ہوتا رہا۔ (زک، اس شمارے میں امتیاز علی تاج کا ''نوٹ'' بہ عنوان''مسز نذر سجاد حیدر کا روزنامچہ'' ص۲۹۴)۔۔۔۲ستمبر۱۹۴۴ء کے شمارے سے اسی روزنامچے کے سلسلے کی تحریر''گزشتہ آیام اور ماہ صیام'' کےعنوان سے شائع ہونا شروع ہوئی اورس کی پہلی قسط کی ابتدا میں امتیازعلی تاج کا یہ نوٹ شائع ہوا۔''جو عظیم صدمہ مسز نذر سجاد حیدر پر گزر چکا ہے اس کے بعد ان کا پھر تہذیب کو یاد کرنا اخبار پر اور مجھ پر ان کا اتنا بڑا احسان ہے کہ اس کے شکریے کے لئے فی الحقیقت میرے پاس الفاظ نہیں ہیں''۔۔۔(تہذیب نسواں کا شمارہ ۲ستمبر۱۹۴۴ء،ص ۵۱۶)

راقم الحروف چونکہ تہذیب کے تمام شمارے جن میں روزنامچہ شائع ہوا، حاصل نہیں کرسکی اس لئے یہ کہنا مشکل ہے کہ تہذیب میں ''گزشتہ آیام اور ماہ صیام'' کب تک شائع ہوتا رہا۔عمر کے آخری دور میں نذر سجاد حیدر مختلف ذہنی پریشانیوں اور جسمانی بیماریوں میں مبتلا رہیں اس لئے''عصمت'' کراچی میں انہوں نے اپنی متذکرہ بالا سوانحی تحریروں کی اشاعت کے سلسلے میں جن تاریخوں کا ذکر کیا ہے اُسے ان کی یادداشت کی کمزوری کے سبب بلاتحقیق کے قبول نہیں کیا جاسکتا۔

۱۳۔ نذر سجاد حیدر کے اس بیان کو ذہن میں رکھتے ہوئے ان کی صاحب زادی محترمہ قرۃ العین حیدر کے اس بیان کو ملاحظہ فرمایئے۔۔۔''کار جہاں دراز ہے'' (مطبوعہ سنگ میل) کے تعارف (ص۱۲) میں وہ فرماتی ہیں ۔۔۔''اس سوانحی ناول کے ۔۔۔ بہت سے ابواب نذر سجاد حیدر کے''روزنامچے اور ایام گزشتہ'' جو''تہذیب نسواں'' لاہور میں ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۷ء تک اور''عصمت'' کراچی میں ۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۵ء تک وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے۔۔اخذ کئے ہیں''۔۔۔ظاہر ہے کہ قرۃ العین کا یہ بیان مبہم بھی ہے اور غلط بھی۔۔نذر سجاد کی جو سوانحی تحریر ابتدا میں''روزنامچے'' کے عنوان سے تہذیب نسواں میں شائع ہونی شروع ہوئی تھی اس کا آغاز ۴۲ سے نہیں بلکہ بقول مصنفہ ۱۹۰۸ء سے ہوا تھا اورعصمت میں بھی یہ تحریر کچھ اسی عنوان سے شائع ہوئی بعد ازاں اس کا عنوان بدل دیا گیا جیسا کہ میں نے زیرنظر مقالے کے متن میں وضاحت کی ہے۔

قرۃ العین حیدر''دوسروں'' سے گلہ کرتی ہیں کہ انہوں نے ان کے والد اور والدہ کے کام کی قدر و قیمت نہ جانی۔ جب کہ خود ان کا اپنا یہ حال ہے کہ گھر میں پڑے ہوئے لوازمے (مواد) کو اپنے سوانحی ناول میں بروئے کار لاتے وقت انہوں نے اس کا ڈھنگ سے مطالعہ نہ کیا۔''کار جہاں دراز ہے'' میں ماخذ و مقامات کے حوالوں اور بیانات میں اکثر جگہ غلطیاں نظر آتی ہیں۔مصنفہ نے اگرچہ اسے مستند بنانے کے لئے ہر باب کے آخر میں کتبِ حوالہ کی طویل فہرستیں دی ہیں لیکن حال یہ ہے کہ انہوں نے اپنے ان مآخذ کا بغور مطالعہ نہیں کیا بس سرسری مطالعے سے ذہن میں ایک خاکہ سا بنایا اور پھر اپنے باطن کے قصہ گو کے تخیل کو بےغل وغش لمبی لمبی پروازیں کرنے کے لئے آزاد چھوڑ دیا۔''کار جہاں دراز ہے''میں بہت سے مقامات کا بھی بیان ہے اور اکثر مقامات کے بارے میں جو کچھ قرۃ العین نے لکھا ہے وہ حقیقت سے بہت دور اور تخیل سے مکمل طور پر ہم آغوش ہے۔مثلاً صوبہ سرحد کا مشہور شہر نوشہرہ جو جی ٹی روڈ کے عین کنارے پر واقع ہے اسے انہوں نے ایک سرد مقام لکھا ہے جو برف پوش پہاڑوں کے قریب واقع ہے اور جہاں ٹھنڈے پانی کے چشمے بہتے ہیں (ص۱۴۳) جب کہ حقیقت یہ ہے کہ نوشہرہ ویسا ہی گرم ہے جیسے کہ لاہور، دہلی، مرادآباد،لکھنؤ،فرق ہوگا تو زیادہ سے زیادہ انیس بیس کا۔ جی ٹی روڈ پر پشاور کی طرف رُخ کر کے کھڑے ہوں تو نوشہرہ سڑک کے بائیں طرف واقع ہے اور دریائے کابل دائیں

طرف۔ دریا کے پار دائیں طرف شہر سے تعلق رکھنے والی کوئی آبادی آج بھی نہیں ہے لیکن قرۃ العین نے دریا کے پار سے چپراسی کو ڈاک لے کر مسٹر باقر (والد گرامی نذر زہرا) کے بنگلے پر آتا ہوا دکھایا ہے جب کہ ڈاکخانے کی عمارت ہمیشہ سے شہر کے اندر یعنی بائیں طرف ہے۔ قصہ گو قرۃ العین چونکہ اپنی اس کتاب کی فصل چہارم میں نوشہرہ کو دریا کے کنارے واقع لکھ چکی تھیں لہٰذا انہوں نے دریا کا استعمال بھی ضروری سمجھا اور اس کے لئے دریا کے بائیں طرف واقع شہر کے ڈاک گھر سے چپراسی کو ڈاک دلوا کر دائیں طرف دریا کے پار بھجوایا اور پھر دوبارہ اس سے دریا کو عبور کروا کے نوشہرہ چھاؤنی میں بلوا کر مسٹر باقر کے بنگلے پر پہنچایا۔ اسی طرح انہوں نے ''کار جہاں دراز ہے'' کی تحریر کے وقت بھی کاشغر اور مشہد سے قافلے پشاور قصہ خوانی بازار آکر اُترتے دکھائے ہیں۔۔۔ ''کار جہاں دراز ہے'' کتابی صورت میں شائع ہونے سے پہلے قسطوں میں لاہور کے معروف جریدے نقوش میں شائع ہونا شروع ہوئی تھی۔ اور اس کی پہلی قسط ستمبر ۱۹۷۴ء [(شمارہ نمبر ۱۱۹)، (ص ۹ سے ۹۶)] میں شائع ہوئی تھی مصنفہ کے بقول اُس نے داستان ''آج'' سے دس سال قبل لکھنی شروع کی تھی۔ کتاب کے مفصل تعارف میں جہاں یہ اطلاع دی گئی ہے وہاں تاریخ تحریر درج نہیں لیکن نقوش میں شائع شدہ پہلی قسط کے سات سطری تعارف کے آخر میں ۱۲ دسمبر ۱۹۷۳ء مندرج ہے۔ دسمبر ۱۹۷۳ء سے دس سال منہا کریں تو دسمبر ۱۹۶۳ء برآمد ہوتا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب پاکستان اور افغانستان کے تعلقات کشیدہ تھے ویسے بھی یہ وہ دور تھا کہ قافلوں کی شکل میں سامان تجارت کا کابل سے پشاور کے قصہ خوانی بازار میں آنا بند ہوئے برسوں گزر گئے تھے۔ اس زمانے میں تجارتی سامان اونٹوں یا گھوڑوں کے قافلوں کے ذریعے نہیں ریل گاڑیوں اور بحری جہازوں کے ذریعے آنا شروع ہو گیا تھا۔

۱۴۔ John A. Garraty The Nature of Biography. P.149

بحوالہ ڈاکٹر ممتاز فاخرہ، کتاب مذکور ص: ۲۸

۱۵۔ لیل و نہار (روزنامچہ حجاب امتیاز علی مشمولہ ''تہذیب نسواں'' جلد ۴۵، ۸ اگست ۱۹۴۳ء، ص :۵۰۹

۱۶۔ روزنامچہ (ایک پرانی ڈائری کی نقل کہیں کہیں سے)، نذر سجاد حیدر مشمولہ تہذیب نسواں ایضاً، ص :۵۱۵، ۵۱۶

۱۷۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، ''آپ بیتی'' (مضمون) مشمولہ نقوش (لاہور) آپ بیتی نمبر، جون ۱۹۶۴ء، ص:۶۱

۱۸۔ نذر سجاد حیدر۔ روزنامچہ، ''عصمت'' مئی ۱۹۵۱ء۔ ص :۲۴۸